کلامِ باہوؒ کی عمومی مقبولیت اور اس کے رُوحانی اثرات

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

The general acceptance and Spiritual Inspiration of Sultan e Bahu's poetry

ڈاکٹر نعیم انور نعمانی[1]

Abstract:

The land of Punjab is considered very productive with regard to genius. It has produced many famous personalities. They have proved their worth almost in all walks of life. There are also great names in the field of intuitions and spirituality. The bearers of this knowledge were an embodiment of selflessness, loyalty, contentment and truth. Besides, it seems that they survived in every age. The words and sentences produced by them seem to be written even for this present age. In other words their writings seem to be universal. Their teachings have guided people in every age. Their work enlivens the life of a reader. Their work inspires both mind and soul simultaneously and embalishes human character and personality. It also rectifies human action. Besides, it gives sublimity and magnanimity to human personality.

There are, in fact, the sentiments that a reader feels especially going through the verses of Hazrat Sultan Bahoo. A reader meditates over his verses and he constantly enjoys their depth. Then, abruptly he says

The verse of the kings is the king of the verses.

The above verse is clearly a reflection of the poetry by Hazrat Sultan Bahoo. In this article his selected verse which is popular across the board is presented.

علمِ ظاہر جہاں ایک حقیقتِ مسلّمہ ہے وہاں علمِ باطن بھی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، اولیاء اللہ ان دونوں علوم سے خود کو وابستہ اور مزیّن کرتے ہیں، عامۃ الناس میں ان کا تعارف علمِ باطن کا عارفوں کا ہے۔ یہ اپنی ہر بات اور اپنا ہر فعل اللہ ربّ العزت کے اسمِ جلالت سے شروع کرتے ہیں اور ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور درود و سلام کے ساتھ رسول اللہ کی بارگاہ کی طرف یکسو رہتے ہیں، اس لیے حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

بسم اللہ اسم اللہ دا ایہہ بھی گہناں بھارا ھُو(۱)

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر جی سی یونیورسٹی لاہور

کلام باھوؒ کی عمومی مقبولیت اور اس کے روحانی اثرات

یعنی اللہ کے نام سے میں اپنے ہر عمل کو شروع کرتا ہوں، اس لیے کہ ساری برکتیں باری تعالیٰ نے اپنے اسم اعظم میں رکھی ہیں، دنیوی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بہت بڑا قیمتی زیور ہے اور یہ انمول ہے اور جس قول اور عمل کی بنیاد یہ اسم بن جاتا ہے، اسے بھی یہ لازوال بنا دیتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ کی بارگاہ میں ان الفاظ کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں:

حدوں بیحد درود نبی نوں جیندا ایڈ پسارا ھُو(۲)

نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر بے حد حساب اور بے شمار درود و سلام ہو جو وجہِ تخلیقِ کائنات ہیں، جو اس کائنات کا حسن ہیں، جن کے باعث اس کائنات کو معرض وجود میں لایا گیا ہے۔

کلامِ باھو اور معرفتِ الٰہی:

حضرت سلطان باھو لوگوں کو اللہ کی معرفت اور توحید کی جانب متوجہ کرتے ہیں اور ہر انسان کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس کے وجود کا مالک اللہ ہے، اگر انسان اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لے اور معرفت و قربتِ الٰہیہ کی منزل کو حاصل کرنے کا ارادہ مصمم کر لے اور اپنے اندر شوق و ذوق کا جذبہ پیدا کر لے تو اس منزل کا حصول اس کے لیے ممکن ہو جاتا ہے۔

ایہ تن ربّ سچے دا حُجرا وچ پا فقیرا جھاتی ھُو
ناں کر منت خواج خضر دی تیرے اندر آب حیاتی ھُو
شوق دا دیوا بال ہنیرے متاں لبھی وست کھڑاتی ھُو
مرن تھیں آگے مر رہے باھو جنہاں حق دی رمز پچھاتی ھُو(۳)

حضرت سلطان باھو انسانی وجود اور قلب کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے بسنے اور ٹھہرنے کا مقام قرار دیتے ہیں اور اس کی پاکیزگی وطہارت کا درس دیتے ہیں اور یہ بات واضح کرتے ہیں کہ انسان اگر اپنے تن کے من کو سنوار لے تو اسے حیاتِ جاوداں کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ منزل ایک سالک کو تب میسر آتی ہے جب وہ اندھیرے مَن میں شوق و ذوق کا دیا و چراغ جلاتا ہے۔ یہی شوق کا جذبہ اسے منزل تک پہنچاتا ہے، اس کا گمشدہ ورثہ و میراث اسے واپس دلاتا ہے اور یوں یہ سالک عرفانِ ذات سے عرفانِ الٰہی کی منزل تک جا پہنچتا ہے۔ ایسے نفوس کو موت ختم نہیں کرتی، یہ نفوس مَر کر بھی اپنی روح کے فیض کے ذریعے زندہ و تابندہ رہتے ہیں۔

جب انسان معرفتِ الٰہی کو اپنی منزل بنا لیتا ہے، اس کے لیے زادِ راہ شوق کو ٹھہراتا ہے، تو وہ اپنے مَن کی دنیا میں نظر کرتا ہے، تو اس کی من کی دنیا اسے مولا کی خبر دیتی ہے، قرآن اس تصور کو یوں بیان کرتا ہے:

وَفِيٓ أَنفُسِكُمۡۚ أَفَلَا تُبۡصِرُونَ۔(۴)

''اور وہ خود تمہارے نفوس میں بھی ہے۔''

علامہ محمد اقبال اسی تصور کو اپنے اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی (۵)

جب انسان اپنے من کی کائنات سے کائناتِ آفاق میں آیاتِ الٰہی کے نظارے کرنے کے لیے شوق کے سمندر میں ڈوب کر اپنی نگاہیں اُٹھاتا ہے تو کائناتِ آفاق اس پر اپنے نظارے یوں منکشف کرتی ہے، قرآن بیان کرتا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۶)

''عنقریب، ہم اپنی نشانیاں اُنہیں اطراف عالم میں اور خود ان کی ذاتوں میں دکھادیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی حق ہے۔''

ظاہر کی باطن سے مطابقت:

حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ انسان کے باطن میں تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان کے باطن کے سنورنے سے انسان کا ظاہر بھی سنور جائے۔ اس لیے کہ باطن کی پاکیزگی وطہارت ظاہر کے شفاف اور اُجلا پن میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انسان کے ظاہر کی دُنیا میں باطن ہی موثر ہوتا ہے اور وہ ہر عمل کو اس کے مقصد اور رُوح تک لے جاتا ہے، اگر بظاہر کوئی عمل دکھائی دے مگر اس میں اس کی رُوح نہ ہو تو حضرت سلطان باہو ایسے عمل کو بے سود قرار دیتے ہیں۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ:

تسبی پھری تے دل نہ پھریا ، کی لیناں تسبی پھڑ کے ھُو
علم پڑھیا تے اَدب نہ سکھیا ، کی لیناں علم نوں پڑھ کے ھُو(۷)

تسبیح ایک عمل ہے جو ایک سالک کا وظیفہ ہے، اس عمل و وظیفے کا مقصد یہ ہے کہ سالک کا دل اللہ کی معرفت کی طرف کاملاً راغب ہو جائے اور جوں جوں تسبیح پھرتی جائے معرفت اور قربتِ الٰہیہ کی طرف سفر تیزی سے آگے بڑھتا جائے اور اگر تسبیح کے دانے گرتے جائیں، دل کی دھڑکن اللہ کی طرف نہ ہو، دل کو وصالِ الٰہی کے جام میسر نہ آئیں اور دل قربتِ الٰہی کی لذت وسرور سے محروم رہے تو ایسے وظیفے اور تسبیح کا کیا فائدہ؟۔۔۔ اسی طرح علم کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود بھی سنور جائے اور دوسروں کو بھی سنوارے، خود بھی تہذیب یافتہ ہو جائے اور معاشرے کو بھی تہذیب سے آراستہ کرے، خود بھی مؤدب ہو اور معاشرے کو بھی مؤدب بنائے، خود بھی اعلیٰ انسانی اخلاق واقدار کا مرقع ہو اور دوسروں کو بھی ان کا پاسدار بنائے، یہ عمل ''علم نافع'' کہلاتا ہے۔ انسان کا یہ وظیفہ عملِ صالح بنتا ہے، اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں: کہ علم پڑھ کر اگر انسان میں ادب نہ آئے تو ایسے علم کا کوئی فائدہ ونفع نہیں ہے اور جس کا فائدہ نہ ہو اسے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں، اس عمل سے جہاں صلاحیت کا ضیاع ہے وہاں وقت کی بھی بربادی ہے۔ مزید برآں حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

چلّے کٹّے تے کجھ نہ کھٹّیا کی لیناں چلّیاں وڑ کے ھُو
جاگ بناں دُدھ جمدے نا ہیں باھُو بھانویں لال ھوون کڑھ کڑھ کے ھُو(۸)

روحانی مجاہدہ اور عرفانِ الٰہی:

وہ سالک جو چلّوں اور وظیفوں پر بڑا دھیان دیتا ہے اور ان کو اپنی زندگی میں لازمی بنیادوں پر اختیار کرتا ہے، اس کے لیے مقامِ غور یہ ہے کہ یہ چلّے اور وظیفے بذاتِ خود مقصود نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد عرفانِ ذات اور عرفانِ الٰہی ہے، اگر چلّوں سے یہ مقصد حاصل نہ ہونے پائے تو پھر یہ عمل سراسر بے فائدہ ہے۔ مزید برآں فرماتے ہیں کہ اس عمل کو ایک چیز، نتیجہ خیز بنا سکتی ہے اور وہ ہے ''نگاہِ مرشد''۔ اور وہ مرشدِ کامل کی باطنی توجہ ہے، مرشدِ حق کی سرپرستی اور راہنمائی ہے جو سالک کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ اگر کوئی سالک اس نعمت سے محروم ہے تو وہ جان لے کہ جس طرح دودھ کبھی بھی ''جاگ'' کے بغیر دہی نہیں بنتے اور نہ ہی اس قابل ہوتے ہیں کہ ان سے مکھن نکلے اگرچہ وہ دودھ خمیر و جاگ کے بغیر گرم ہو کر کتنے ہی سرخ ہو جائیں، دودھ اس کیفیت کو پہنچ کر بھی مکھن دینے کے قابل نہیں ہوتا، وجہ اس کی فقط یہی ہے کہ اس دودھ کو جاگ (خمیر) نہیں لگا۔ اسی طرح سالک کی عبادت و ریاضت اور وظائف و اوراد کی بھی یہی کیفیت اور حالت ہے۔ جب تک مرشد کی نگاہ جو مرید کے لیے دودھ کی طرح ''جاگ'' کی حیثیت رکھتی ہے، یہی نگاہ جو سالک کو اپنے اعمال و وظائف کے لیے حاصل نہ ہو تو اعمال کا یہ بوجھ اور وظائف کا یہ عملِ کثیر سالک کو معرفت کی منزل پر نہیں پہنچاتا، اس لیے ایک سالکِ حقیقی کو مرشدِ حقیقی کی نگاہ کرم کا طالب بن کر رہنا چاہیے۔ یقیناً اسی تصور کو زبانِ زدِ خاص و عام یہ شعر بھی اپنی پوری معنویت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

نگاہِ ولی میں وہ تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

تصوف و روحانیت میں نگاہ و صحبت اپنے اندر ایک اثر کیمیا رکھتی ہیں اور اللہ کے ولی کی صحبت انسان کو معرفتِ الٰہی تک لے جاتی ہے، اسی تناظر میں مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں:

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا(۹)

اور یہی تصور ہمیں حضرت وارث شاہ کے ہاں یوں ملتا ہے:

بناں مرشداں راہ نہ ہتھ آوے
دُدھ باجھ نہ رِجھدی کھیر سائیں (۱۰)

علمِ ظاہر و باطن کا تقابل:

اس جہانِ رنگ و بُو میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جنہیں معاشرے میں ظاہری اعتبار سے بڑی عزت اور بڑا احترام حاصل ہے۔ وہ اپنے تحصیلِ علم کے وظیفے کی بناء پر تکبر و غرور میں مبتلا ہیں، اسی ظاہری شرف ہی پر وہ قناعت کیے ہوئے ہیں، اس تحصیلِ علم کی باطنی حقیقت سے وہ نابلد ہیں، انہیں اپنے وظیفۂ علم کے ذریعے معرفتِ الٰہ کی منزل تک پہنچنا تھا۔ وہ اس وظیفے کی ظاہری صورت ہی میں کھو گئے ہیں اور حقیقت سے محروم ہو گئے، اس لیے مخلوق کے در پر پڑے ہوئے ہیں اور انہیں خالق کے دَر تک پہنچنا تھا، مخلوق کے دَر کی دریوزہ گری نے ان کو ان کی محتاجگی کے سلسلے میں جکڑ لیا ہے، خدا کی محتاجگی میں ان کے لیے عزت تھی، مخلوق کی محتاجگی ان کے لیے

ذلت ہے۔ یہ ان کے ساتھ اس لیے ہوا ہے کہ یہ عرفانِ حق کی منزل بھول گئے۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باہو ان تصورات کو اپنے اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

پڑھ پڑھ عالم کرن تکبّر ، حافِظ کرن وڈیائی ھُو
گلیاں دے وچ پھرن نمانے وَ تَن کتاباں چائی ھُو
جتھے ویکھن چنگا چوکھا اوتھے پڑھن کلام سوائی ھُو
دوہیں جہانیں سوئی مٹھے باھو جنہاں کھادی ویچ کمائی ھُو(۱۱)

عالم اور حافظ خوب پڑھتے ہیں، علم حاصل کرنے اور قرآن پاک یاد کرنے میں بہت زیادہ محنت اور جد وجہد کرتے ہیں، انہوں نے اپنے تحصیلِ علم کے سفر کو ادھورا چھوڑ دیا ہے اور انہوں نے تحصیلِ علم کے سفر کو دو پہلوؤں، علمِ ظاہر اور علمِ باطن میں سے فقط علمِ ظاہر کو حاصل کیا ہے اور علمِ باطن کو چھوڑ دیا ہے۔ فقط علمِ ظاہر کو حاصل کرنے کی وجہ سے اور علمِ باطن کو ترک کرنے کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگوں کے محتاج ہو گئے ہیں، گلیوں گلیوں میں پھرتے ہیں، لوگوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، جہاں چمک دمک زیادہ نظر آتی ہے وہاں اپنے فن وصلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دُنیاداروں کی توجہ حاصل کر کے دنیوی زادِ راہ بناتے ہیں، کوئی دنیادار اُنہیں دیتا ہے اور کوئی انہیں محروم کرتا ہے۔ ان کا منصب ومقام یہ نہ تھا، چونکہ انہوں نے اپنے تحصیل علم کے سفر کو ادھورا رکھا اور علمِ باطن کی تحصیل نہ کی، اس لیے لوگوں کے دست نگر بن گئے۔ ہاں! اگر یہ تحصیلِ علمِ باطن بھی کرتے، خود کو دونوں علوم کے جامع بناتے، پھر گلیوں کوچوں میں یہ مارے مارے نہ پھرتے بلکہ مخلوقِ خدا ان کے پیچھے پیچھے ماری پھرتی، یوں یہ خدا کے محتاج ہوتے اور مخلوقِ خدا کے محتاج نہ ہوتے۔

دوسرے مقام پر اسی تصور کو یوں بیان کیا:

حافِظ پڑھ پڑھ کرن تکبّر مُلّاں کرن وڈیائی ھُو
ساون مانہہ دے بدلاں وانگوں پھرن کتاباں چائی ھُو(۱۲)

اسی طرح ایک عالم اور حافظ کے کردار کے علاوہ ایک پیر، شیخ کا کردار بھی معاشرے میں نظر آتا ہے۔ ان میں سے بھی بعض کی حالت ان ہی حفاظِ ظاہر اور علماءِ ظاہر کی سی ہے۔ ان کا تذکرہ یوں کرتے ہیں کہ:

پڑھ پڑھ علم مشائخ سداون کرن عبادت دوہری ھُو
اندر جھگھی پئی لٹیوے تن من خبر ناں موری ھُو(۱۳)

فقط ظاہرداری فقیری نہیں:

تحصیلِ علم کے راہی کچھ ایسے بھی ہیں، جو علمِ ظاہر کو ہی سب کچھ سمجھ کر اپنا علمی سفر روک دیتے ہیں، علومِ ظاہر اور علومِ باطن کی منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک مرحلے کی تکمیل پر خود کو دونوں علوم کا جامع بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اپنے نام والقابات کا از خود تعین کر لیتے ہیں، خود کو زمانے کا سب سے بڑا ولی اور پیر ظاہر کرتے ہیں۔ ظاہری شکل وشباہت خوب عالمانہ اور فقیرانہ

بناتے ہیں، تاکہ لوگوں کو یہ شب زندہ دار اور عبادت گزار دکھائی دیں اور اپنی عبادت وطاعت میں نمود ونمائش اور ریاکاری اختیار کرتے ہیں، اور ہر وہ عمل اختیار کرتے ہیں جس کے ذریعے لوگ ان سے مرعوب ہوں اور ان کی طرف مرغوب ہوں اور ان کو مستجاب الدعوات سمجھیں اور ان کے مقامِ ولایت کے معترف ہوں، گویا ایک ولی اللہ کے ہر بھیس کو اپنا ظاہری بھیس بناتے ہیں، اس کے ہر عمل کو اپنا عمل ظاہر کرتے ہیں، اس کے ہر طریق کو اپنا طریق بناتے ہیں، اس کی ہر رَوِشِ حیات کو اپنے اندر جاگزیں کرتے ہیں اور ایسی ظاہری نقل کرتے ہیں کہ لوگوں کو اصل کا گمان ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اندر کی دنیا تاریک ہے، ان کے باطن میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے، ان کی متاعِ باطن لٹ چکی ہے، ان کے اندر کی جھونپڑی خستہ وبرباد ہو چکی ہے۔

ان کا تن ومن معرفتِ توحید سے محروم ہے۔ وصالِ الٰہیہ اور قربتِ الٰہیہ کی منزل ان کو حاصل نہیں۔ ان کی باطن کی دنیا ابھی آباد نہ ہوئی تھی، اُنہوں نے دنیوی مفاد کے لیے اس دنیا کا خود کو آباد کار بتلایا، ہر ظاہری حربہ اختیار کر کے ان کی صف میں شامل ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن حقیقت تو حقیقت ہے وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے، اس لیے کہ حقیقت ہی صداقت ہے، صداقت ایک خوشبو کی طرح ہے جو اپنا پتہ خود دیتی ہے، اسے بناوٹ اور تصنع سے غرض نہیں، وہ لوگوں کے مشامِ جان میں خود اُترتی ہے اور خود کو منواتی ہے۔ ظاہری تصنع کچھ دیر دھوکا وفریب دے سکتا ہے مگر حقیقت کو ظاہر ہونے سے روک نہیں سکتا۔ اس لیے احادیثِ مبارکہ میں ان کی نشانیاں اور علامات بیان کردی گئی ہیں، جن کو لوگ بطور ولی اللہ پہچان سکتے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جھوٹ تو اپنی نشانیوں سے ظاہر ہو اور حق اپنی سچی نشانی سے ظاہر نہ ہو، شرط فقط تلاش اور جستجو کی ہے۔ جب انسان حق کی تلاش شروع کردیتا ہے تو وہ بالآخر حق کو پالیتا ہے، اس لیے رسول اللہ نے ان اولیاء کی پہچان سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

عن عمر بن الخطاب قال۔ قال النبی ان من عباداللہ لا ناساً ماھم بانبیاء ولا شھداء یغبطھم الانبیاء والشھداء یوم القیامۃ بمکانھم من اللہ قالوا یا رسول اللہ! تخبرنا من ھم قال ھم قوم تحابوا بروح اللہ علی غیر ارحام بینھم ولا اموال یتعاطونھا فواللہ ان وجوھھم لنور و انھم لعلی نور لا یخافون اذا خاف الناس ولا یحزنون اذا حزن الناس(۱۴) وقرأ ھذہ الایۃ : الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (۱۵)

''حضرت عمر بن الخطاب سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے برگزیدہ بندے ہیں جو نہ انبیاء ہیں نہ شہداء ہیں مگر قیامت کے دن خود انبیائ اور شہداء ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مقام دیکھ کر ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہمیں ان کے بارے میں بتائیں کہ وہ کون ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ ایسے لوگ ہیں جن کی باہمی محبت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے نہ کہ رشتہ داری اور مالی لین دین کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! ان کے چہرے پُرنور ہوں گے اور وہ نور سے معمور ہوں گے، انہیں کوئی خوف نہ ہوگا جب لوگ خوفزدہ ہوں گے، انہیں کوئی غم نہ ہوگا جب لوگ غمزدہ ہوں گے۔ پھر آپ نے ان کی شان میں یہ آیت تلاوت فرمائی: خبردار! بیشک اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ وغمگین ہوں گے۔''

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، رسول اللہ سے براہِ راست سوال ہی اولیاء اللہ کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ ان کی پہچان وشناخت کی علامات کیا ہیں، ہم کیسے اور کس طرح ان کو جان سکتے ہیں؟

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سئل رسول اللہ عن اولیاء اللہ فقال الذین اذا رءوا ذکر اللہ۔(۱۶)

''حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم سے اولیاء اللہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: وہ لوگ جنہیں دیکھنے سے اللہ یاد آ جائے وہی اولیاء اللہ ہیں۔''

سلطان باہوؒ کی نظر میں فقیر اور صوفی:

حضرت سلطان باہو ان اولیاء اللہ کا تذکرہ اپنی پنجابی زبان میں ''فقیر'' اور ''مرشدِ کامل'' کی صورت میں کراتے ہیں۔ فقیر اور اللہ کا ولی کون ہوتا ہے؟ فرماتے ہیں:

نام فقیر تنہاں دا باھو قبر جنہاندی جیوے ھُو(۱۷)

''فقیر'' اُن مردانِ خدا اور عارفانِ کامل کا نام ہے جن کی قبر بھی زندہ ہوتی ہے، وہ ساری زندگی ربّ کی یاد میں گزارتے ہیں اور زندگی کا لمحہ لمحہ اس کی اطاعت میں بسر کرتے ہیں، اس کی رضا وخوشنودی ان کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے، وہ اپنے سارے معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں، وہ اپنی زندگی کی ساری خواہشیں بھی مولا کی رضا کے تابع کر دیتے ہیں حتیٰ کہ اپنی زندگی کو زندگی عطا کرنے والے ربّ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قرآن اس امر کا تذکرہ یوں کرتا ہے:

وَأُفَوِّضُ أَمْرِيٓ إِلَى اللّٰهِ۔(۱۸)
''اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''

یہ دنیا میں رہتے ہوئے فنا سے بقاء کی طرف سفر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ جانتے ہیں کہ اس کائنات میں ہر چیز کو فنا ہے، بقاء فقط ربّ کو ہے۔ قرآن بیان کرتا ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔(۱۹)
''ہر کوئی جو بھی زمین پر ہے فنا ہو جانے والا ہے اور آپ کے ربّ کی ذات ہی باقی رہے گی جو صاحبِ عظمت وجلال اور صاحبِ انعام واکرام ہے۔''

گویا یہ اولیاء اللہ اپنی خواہشات اللہ کی مرضی ورضا کے تابع کر کے خود کو فنا فی اللہ کر لیتے ہیں اور فنا فی اللہ کی یہ منزل ہی انہیں بقاء باللہ کا اعزاز عطا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے یہ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان کا فیض اسی طرح تقسیم ہوتا رہتا ہے جس طرح ان کی ظاہری حیات میں ہوتا تھا، لوگ ان کے مزارات پر آتے ہیں، اللہ ربّ العزت سے ان کے توسل سے مانگتے ہیں، باری تعالیٰ ان کے مقامِ ولایت کے باعث لوگوں کی دعاؤں کو استجابت کی شان عطا کرتا ہے، ہر کسی کی صدق واخلاص کے ساتھ مانگی ہوئی دعا قبولیت کا شرف پاتی ہے۔ اب اسی حقیقت کا اظہار ہر کوئی اپنی اپنی علمی استعداد کے مطابق کرتا ہے۔ کچھ کے اظہارِ بیان حقیقت کشاں ہوتے ہیں اور کچھ کے اظہارِ بیاں شریعت میں قابلِ گرفت ٹھہرتے ہیں، کچھ پر مفتی کا فتویٰ بسیار کاوش لگتا ہی نہیں اور بعض پر فوراً فتویٰ لگ

جاتا ہے، جبکہ حقیقت ہر حال میں ایاک نعبدو ایاک نستعین پر قائم و دائم رہتی ہے۔

فقیری اور حبِ الٰہی:

انسان اپنی حاجت برآری پر کبھی ٹھوکر کھاجاتا ہے، اس لیے علم ظاہر کی زد میں آتا ہے۔ اس لیے حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

از مردہ دل بہتر بود قبرِ فقیر
ہر چہ داری حاجتی زاں خوش طلب گیر(۲۰)

یعنی وہ شخص جس کا دل مردہ ہے ایسے مردہ شخص سے تو فقیر اللہ والے کی قبر بہتر ہے، اس لیے کہ وہاں جو شخص بھی کوئی حاجت لے کر آئے اور اللہ سے اس فقیر کے وسیلے سے اپنی حاجت طلب کرے تو باری تعالیٰ اپنے فیض و کرم سے اس فقیر کے صدقے اس کی حاجت کی تکمیل کردے گا۔

مزید برآں فرماتے ہیں: یہ فقیر نام اور مقام آسانی سے میسر نہیں آتا فقیر وہی ہوتا ہے جو ربّ کی طلب میں فنافی اللہ ہوجائے، جو اپنی ساری خواہشات کو مولا کی رضا میں فنا کردے، اُس کا ہر عمل مولا کی رضا و خوشنودی کا آئینہ دار دکھائی دے، ایسی طلب صادق ہی انسان کو مقامِ ولایت اور مقامِ فقر عطا کرتی ہے۔ اسی حقیقت کو حضرت سلطان باہو یوں واضح کرتے ہیں:

نام فقیر تد تھیندا باھُو جد وِچ طلب دے مریئے ھُو(۲۱)

طلبِ مولا جب تک جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہوجائے اور اس طلب میں انسان اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے آمادہ نہ ہوجائے اور عملاً ایسا نہ کردے تو تب تک وہ فقیر نہیں بنتا ہے۔ فقط اس طلب کا دعویٰ کرنے کی بنا پر وہ راہِ سلوک کی ایک ''لکیر'' تو ہوسکتا ہے مگر ''فقیر'' ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس لیے فقیری طلبِ مولا میں مرنے کا نام ہے اور اس طلب میں مرنا ہی ''نامِ فقیر'' اور ''مقامِ فقیر'' ہے۔ فقط دعویٰ کرنا اور حبِّ دُنیا کو اپنا لباس بنانا اور دنیا طلبی ہی میں خود کو ہر وقت ''فقیری'' کے نام پر مشغول رکھنا، قطعاً فقیری نہیں ہے۔ اس لیے سلطان العارفین حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

جیندے اندر حُبّ دُنیا باھُو اوہ مُول فقیر نہ تھیوے ھُو(۲۲)

دنیا کی محبت اور ربّ کی محبت ایک دل میں سما نہیں سکتیں۔ دل، ایک محبت کا امین ہوتا ہے، ایک محبت کو اپنے اندر بساتا ہے۔ دنیا دار محبتِ دنیا میں دل لگالیتا ہے اور فقیر محبتِ الٰہی کو اپنے قلب میں جاگزیں کرلیتا ہے اور اسی محبت کے باعث وہ معرفتِ الٰہی کی منزل تک اس طرح پہنچتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو معرفتِ الٰہی کا ایک مظہر بنادیتا ہے۔ اس کے جسم کا ایک ایک جوڑ اور ایک ایک ہڈی معرفتِ الٰہی کا پتہ دیتی ہے۔

اس لیے حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

نام فقیر تنہاں دا باھُو جیہڑے ہڈاں توں مکھن کڈھیندے ھُو (۲۳)

فقیر وہی ہوتا ہے جو عارف باللہ ہو، جو ذکر نفی واثبات کے ذریعے اپنے فانی جسم کی ہڈیوں سے معرفتِ الٰہی کا مکھن نکال لے، اپنے وجود کو عبادت وطاعت میں اس طرح مصروف کرے اور اسے اس راہ میں اس طرح تھکا دے کہ اس کے وجود کا لُوں لُوں معرفتِ الٰہیہ کی شناسائی دے۔ یہی عمل ایک سالک کو فقیر بنا دیتا ہے۔ اس لیے کہ فقیر وہی ہوتا ہے جو کسی بھی لمحہ اپنے یار کو نہ بھولے، یار کی یاد فقیر کی زندگی ہے اور اس کی زندگی کے سانس یار کی یاد سے چلتے ہیں، ان سانسوں کو آکسیجن یار کی یاد فراہم کرتی ہے، اس لیے فقیر کی زندگی میں یار اور اس کی یاد لازمۂ زیست ہے۔ اس لیے فرماتے ہیں:

نام فقیر تنہاندا باھو جہڑا دم دم دوست سمھالے ھُو(۲۴)

فقیر وہی ہے جو کسی بھی لمحۂ حیات کو محبوبِ حقیقی کی یاد کے بغیر نہ گزارے، فقیر کا ہر دم اپنے یار ہمدم کے ساتھ گزرتا ہے، فقیر کی نیت اور عمل کا حاصل یار اور دلبر کی یاد ہے۔ اس لیے فقیر، یار اور اس کی یاد کے بغیر ایک پل بھی نہیں جی سکتا۔ اب جبکہ فقیر کی زندگی یادِ محبوب کا نام ہے اور اب اس یاد کا عالم یہ ہوتا ہے کہ وہ خود تو یار کی یادوں اور جلوؤں میں محو رہتا ہے، پھر ایک مقام اس فقیر کی زندگی میں ایسا آتا ہے جب وہ یار کے ان جلوؤں میں اَوروں کو شریک کرنے والا بھی بن جاتا ہے۔ وہ بیٹھے بٹھائے یار کی بارگاہ میں حضوری کرا دیتا ہے اور یادِ محبوب کے سفر کو جلوۂ ذاتِ محبوب تک لے جاتا ہے، کسی بھی حرمان نصیب کے لیے ایک فقیر کے ذریعے جلوۂ ذاتِ محبوب کی جلوہ آرائی ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی نعمت نہیں کر سکتی اور یہ نعمت فقیروں کے دَر سے اور اُن کی سنگت وصحبت سے ہی میسر آتی ہے۔ اس لیے حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

نام فقیر تنہاندا باھو جہڑا گھر وچ یار وِکھالے ھُو(۲۵)

فقیر اُس عارف باللہ کا نام ہے جو گھر میں بیٹھے بٹھائے دیدارِ محبوب کا شرف کرا دے، جو حجابات کو نگاہوں سے اُٹھا دے اور سالک کو محبوب کی کچہری میں پہنچا دے، خود بھی حضوری میں رہے اور دوسروں کو بھی صاحبِ حضور بنا دے، جو خود بھی واصلِ محبوب ہو اور اوروں کو بھی واصل کر دے۔ فقیر انسان کے فصل کو وصل میں بدلتا ہے، فصل محرومی ہے اور وصل کامیابی اور حضوری ہی حضوری ہے۔ فقیروں کے دَر سے وصل کی خیرات ہی ملتی ہے اور یہی کسی سالک کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے اور اس پر اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے اور اس پر رب کا فضلِ عظیم ہے جس کے لیے اسے منتخب کیا جاتا ہے۔

حضرت سلطان باہو نے فقر کا یہ لفظ قرآن وحدیث سے اخذ کیا ہے اور اسے اپنے کلام میں وسیع المعنی مفہوم میں استعمال کیا ہے، قرآنِ حکیم میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَآأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللهِ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ(۲۶)

''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی بے نیاز سزاوار حمد وثناء ہے۔''

اور اسی طرح سورہ محمد میں ارشاد فرمایا:

وَاللهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (۲۷) اور اللہ بے نیاز ہے اور تم سب محتاج ہو

''فقیر'' کی تعریف خود قرآن جامع انداز میں بیان کرتا ہے اور فقراء کی یہی حالت ان کے احوال کی عکاسی کرتی ہے۔ ارشاد

کلام باہوؒ کی عمومی مقبولیت اور اس کے روحانی اثرات

باری تعالیٰ ہے:

فَفِرُّوا اِلَی اللّٰہِ (۲۸)۔ ''پس تم اللہ کی طرف دوڑے چلو۔''

اس لیے حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

فقیری نام تنہاندا باھُو جہڑے دل وچ دوست ٹکاون ھُو(۲۹)

''فقیر'' وہ ہے جو عارفِ کامل ہے اور فقیری ان ہی عرفاء کا طرزِ حیات ہے جو عرفانِ الٰہی کی مستی میں مست رہتے ہیں، جو ہمہ وقت معرفتِ الٰہی کے جام نوش کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ وہ اپنے دل کو محبوبِ حقیقی کا ٹھکانہ بنا لیتے ہیں، وہ اپنے دل کو ہر غیر سے پاک کر لیتے ہیں اور اسے فقط اور فقط اپنے مولا کے لیے مختص کر دیتے ہیں۔ پھر یہ ہر لحہ اس کی یاد میں بسر کرتے ہیں اور ان کی زندگی کا کوئی بھی لحہ اس کی یاد سے خالی نہیں ہوتا۔ جب فقیر کی یہ حالت ہوتی ہے تو حضرت سلطان باہو اسے یوں بیان کرتے ہیں:

جو دم غافل سو دم کافر اَسانوں مرشد ایہہ پڑھایا ھُو(۳۰)

ایک ایک لحہ جو غفلت میں گزر جائے اور جس میں ذکرِ الٰہی نہ کیا جائے وہ لحہ انسان کو روحانی دنیا میں کفر تک لے جاتا ہے۔ اہلِ سلوک کا یہی طرزِ عمل رہا ہے کہ وہ ہر لحظہ اپنے مولا کی یاد میں بسر کرتے ہیں اور کسی بھی لحہ کو ذکرِ الٰہی سے خالی نہیں ہونے دیتے اور ایسے ہر لمحے کو وہ ناشکری اور کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔

فرائضِ مرشد:

''فقیر'' کی اصطلاح کے ساتھ حضرت سلطان باہو ''مرشد'' کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں، دونوں قریب المعنی اور باہم مترادف ہیں۔ مرشد کے تصور کو اپنے کلام میں یوں واضح کرتے ہیں:

کامل مرشد ایسا ہووے جہڑا دھوبی وانگوں چھٹّے ھُو
نال نگاہ دے پاک کریندا وچ سجّی صبون نہ گھتّے ھُو
مَیلیاں نوں کر دیندا چٹّا وچ ذرہ میل نہ رکھے ھُو
ایسا مرشد ہووے باھُو جہڑا لُوں لُوں وچ وَسّے ھُو(۳۱)

مرشدِ کامل ایسا ہو جو ایک طالب اور سالک کو کدورتِ نفس سے بچائے اور اُس کے نفس کا تزکیہ کرے، جس طرح ایک دھوبی میلے کپڑے کو پٹخ پٹخ کر صاف کرتا ہے اسی طرح مرشد میلے نفس کو ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعے پاک وصاف کرے۔ مرشد یہ کام دھوبی کی طرح کھارے پانی اور صابن سے نہیں کرتا بلکہ اپنی نگاہ کے اثر سے سالک کو پاک وصاف کر دیتا ہے اور اسے نفس امارہ کے چنگل سے آزاد کراتا ہے اور اسے نفس لوامہ اور ملہمہ کی طرف بڑھاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُس کے سفر کو مزید تیز کرتے ہوئے نفسِ مطمئنہ اور نفسِ راضیہ و مرضیہ کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس سارے سفر کے دوران مرشد اپنے طالب و سالک کو گناہوں سے

چھٹکارا دلاتا رہتا ہے اور گناہوں کی مَیل سے اُسے بچاتا رہتا ہے اور اپنی نگاہوں سے اسے دھوتا رہتا ہے۔ گناہوں کی طرف اس کے میلان کو اپنی نگاہوں کے اثر سے دُور کرتا رہتا ہے، ایک وقت آتا ہے کہ گناہوں کا سیاہ پن اُس کے وجود سے دُور ہوجاتا ہے وہ چٹّا اور سفید اور رصاف وشفاف اور طاہر ومطہر بن جاتا ہے۔ اسی مقام کی نشاندہی قرآن یوں کرتا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (۳۲)

یعنی بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس نفس کو رزائل سے پاک کرلیا اور اس میں نیکی کی نشوونما کی اور بے شک وہ شخص نامراد ہوگیا جس نے اسے گناہوں میں ملوث کرلیا اور نیکی کو دبا دیا۔

حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

باجھ فقیراں کسے نہ ماریا باھُو ایہو چور اندر دا ھُو (۳۳)

ایک روحانی پیشوا، ایک پیر وفقیر، ایک مرشد ومربی کی یہی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے زیرِ تربیت طالب کے تن کو اللہ کی اطاعت سے سنوارے اور اس کے من کو اللہ کی محبت سے آباد کرے، ایسا مرشد جس کے ذریعے سے، جس کی صحبت کے اثر سے اور جس کی نگاہ کی تاثیر سے اور جس کے قول کی اثر انگیزی سے ایک سالک کا تن بھی بدلے اور من بھی سنورے، ایسا مرشد جو طالب کے جملہ احوالِ حیات کو بدل کر رکھ دے، اُس کی سوچ کے دھاروں کو اللہ کی اطاعت کی طرف راغب کردے اور اس کے عمل کی جہتوں کو اللہ کی رضا وخوشنودی کی طرف متوجہ کردے تو ایسا مرشد ہی ایک طالب کے لُوں لُوں میں بستا ہے، اس سالک کے وجود کا ذرہ ذرہ ایسے مرشد سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور یہی محبتِ شیخ اسے فنا فی اللہ کی طرف لے جاتی ہے۔

اسی طرح ایک مرشد اور روحانی مربی کی ذمہ داری کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ ایک مرشد کا یہ فرض ہے کہ وہ طالبِ الٰہی کے دل کے دریچے کو کھول دے اُس کے دل کو مولا کی طرف راغب کردے اور یہ رغبت اپنے اندر ایک ثابت قدمی کی شان لیے ہوئے، اور یہ نعمت تب میسر آتی ہے جب ایک مرشد معرفتِ الٰہی کے راز اور قربتِ الٰہی کے بھید سے ایک طالب کو آشنا کردیتا ہے۔ پھر جوں جوں سالک اس بھید اور راز کو سنبھالے رکھتا ہے اور اس پر استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے توں توں معرفتِ الٰہی کے سمندروں کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ قرآن اسی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ (۳۴)

''بے شک جن لوگوں نے کہا: ہمارا ربّ اللہ ہے پھر وہ اس پر مضبوطی سے قائم ہوگئے تو ان پر فرشتے اُترتے ہیں۔''

مرشدِ کامل اور حصولِ معرفت:

معرفتِ الٰہی اور قربتِ الٰہی کی نعمت استقامت کے ذریعے ملتی ہے اور راہِ حق پر ثابت قدمی مرشد کی نگاہِ التفات سے ملتی ہے۔ ان صفات کے حامل شیخ ومرشد کا تذکرہ سلطان باہو یوں کرتے ہیں:

مرشد کامل ایسا مِلیا جس دل دی تاکی لاہی ھُو
مَیں قربان اس مرشد باھُو جس دَسیا بھیت الٰہی ھُو (۳۵)

کلام باہوؒ کی عمومی مقبولیت اور اس کے روحانی اثرات

مرشد کامل وہ ہے جو عارف کامل ہے جو اپنے زیرِ تربیت کو معرفتِ الٰہی کے جام پلاتا ہے، جو غافل دلوں کو اللہ کی یاد میں شاغل کرتا ہے، جو ربّ کی اطاعت وعبادت سے دُور لوگوں کو رازِ عبادت سے آشنا کرتا ہے، جو ربّ کی قربت کے راز سالک پر آشکار کرتا ہے۔ایسا مرشد ہی ایک سچا رُوحانی مرشد، ایک صادق پیر، ایک کامل فقیر اور ایک حقیقی ولی اللہ ہے۔

حضرت سلطان باہو اسی مرشدِ کامل کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید برآں فرماتے ہیں:

کامل مرشد مِلیا باھُو اوہ آپے لیسی ساراں ھُو(۳۶)

وہ مرشد کامل جس کے ذریعے عرفانِ حق حاصل ہوتا ہے، وہ خود بخود ہی راہِ سلوک کے مسافر کی خبر گیری، نگرانی اور نگہبانی کرتا ہے۔مرشد کی نگرانی اور نگہبانی یہ ہے کہ اسے دولتِ عرفان میسر آجائے اور وہ سالک صحیح معنوں میں طالبِ مولی ہوجائے اور اس کے من میں معرفتِ الٰہیہ کا چشمہ جاری ہوجائے اور یہ اصل کام پیروں، فقیروں اور ولیوں کا ہے۔عصرِ حاضر میں اگر پیرانِ کرام اپنے اس کردار کو زندہ کرلیں تو یہ معاشرہ جنت نظیر بن سکتا ہے اور تصوف پر اٹھنے والے تمام اعتراضات کا خاتمہ ہوجائے گا اور اس معاشرے کا ایک ایک فرد دوسرے کے لیے سراپا خیر بن جائے گا، بہت سی معاشرتی برائیوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور انسان کو اپنے مقامِ انسانیت سے آشنائی ہوجائے گی۔

اولیاء اللہ انسانوں کے دلوں میں معرفتِ الٰہی کی فصل کاشت کرتے ہیں۔وہ انسانوں کے بند دلوں کو اللہ کی معرفت سے کھولتے اور آباد کرتے ہیں۔انسان کے دل کی آبادی اس کے ظاہر کی نموداری کو متاثر کرتی ہے، من کا اثر تن پر وارد ہوتا ہے۔من سنورتا ہے تو تن بنتا ہے، من بگڑتا ہے تو تن برباد ہوتا ہے۔اس لیے رسول اللہ نے ارشاد فرمایا:

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلھا و اذا فسدت فسد الجسد کلھا الا و ھی القلب۔(۳۷)

''خبردار! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہوجائے تو سارا انسانی جسم درست ہوجاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا انسانی جسم خراب ہوجاتا ہے، خبردار! وہ گوشت کا لوتھڑا دل ہے۔''

کلامِ باھُو کے آفاقی اشعار:

اولیاء اور عرفاء ایک سالک کے قلب کی اصلاح کرتے ہیں۔اولیاء اللہ تطہیرِ قلب کو ایک طالب کا سب سے پہلا وظیفہ بناتے ہیں۔تطہیر کے ذریعے جب دل کا تزکیہ ہوجاتا ہے تو اب اس دل کی زمین میں اللہ کی معرفت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور معرفتِ الٰہی کی بوٹیاں لگائی جاتی ہیں۔اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت سلطان باہو فی زمانہ اپنے مقبولِ عام شعر میں یوں تذکرہ کرتے ہیں:

الف: اللہ چنبے دی بوٹی میرے من وچ مرشد لائی ھُو
نفی اثبات دا پانی ملیس ہر رگے ہر جائی ھُو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلاں تے آئی ھُو
جیوے مرشد کامل باھُو جیں ایہ بوٹی لائی ھُو(۳۸)

اسم ''اللہ'' چنبے کے بوٹے کی طرح پُرمہک ہے۔ اسے مرشد کامل نے میرے دل وجان کی زمین میں کاشت کیا ہے اور میرے من میں بوئے ہوئے اسمِ ذات کے اس پودے کے ہررگ وریشہ اور ہرمقام کی لاالہ الااللہ کے نفی واثبات کے پانی سے سیرابی ہوئی ہے اور یہ اسم اللہ ذات کا پودا جب نشوونما پاکر غنچہ آور ہوا تو اس نے میرے من کے اندر ہر طرف خوشبو پھیلا دی ہے۔ خدا کرے یہ مرشدِ کامل سلامت رہے جس نے اس من میں اسمِ ذات کا یہ پودا کاشت کیا ہے۔

یہ اشعار حضرت سلطان باھو کے عقیدت مند ہر جگہ پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ کلامِ باھو میں ان اشعار کو وہ حیثیت حاصل ہے کہ زبان پر آتے ہی اور کانوں کی سماعت تک پہنچتے ہی ہر کوئی بے ساختہ بول پڑتا ہے کہ یہ کلامِ باھو ہے۔ پنجابی، سرائیکی اور اُردو جاننے والا ہر شخص اس حقیقت کو بخوبی جانتا ہے کہ یہ اشعار اور اُن کی زبان وبیاں مختص ہے حضرت سلطان باھو کے ساتھ ، یہ اشعار جہاں آپ کے کلام کی آفاقی نمائندگی کرتے ہیں وہیں کلامِ باھو کی حقیقت سے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ یہ کلام سراسر اللہ کی معرفت اور قربت کے رازوں کا آئینہ دار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کلام اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ مرشد اور مربی کا کام ایک سالک کے من کی دنیا کو اللہ کی یاد سے آباد کرنا ہے۔ ایسا مرشد اور شیخ ہی ایک طالب مولیٰ اور ایک سالک الی اللہ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے جو اسے وصالِ الٰہی کی منزل پر پہنچاتا ہے، جو معرفت اور قربتِ الٰہی کے سمندروں میں اسے غوطہ زن کرتا ہے اور رحمتِ الٰہی کے ان موجزن بحروں کی اسے غواصی کراتا ہے، ایسے مرشد کے تصور میں رہنا اور اسے دیکھنا اور اس کی زیارت کے لیے طویل فاصلے طے کرنا اور اس کے دیدار کے لیے تڑپتے رہنا، وہ سالک اپنی ذات کا ایک شیوۂ حیات بنالیتا ہے۔ ایسے ہی مرشد کے لیے ایک سالک کے قلبی اور حُبّی جذبات کو حضرت سلطان باھو یوں بیان کرتے ہیں:

ایہہ تن میرا چشماں ہووے تے مَیں مرشد ویکھ نہ رَجّاں ھُو
لُوں لُوں دے مُڈھ لکھ لکھ چشماں ہک کھولاں ہک کجّاں ھُو(۳۹)

میرا سارے کا سارا وجود ایک چشم بینا ہو جائے اور مَیں شوق ومحبت کی وادی میں مستغرق ہو کر اپنے مرشدِ کامل کی دید کرتا جاؤں اور بار بار اسے دیکھتا جاؤں اور اُس کے بے مثال حسن کا نظارہ کرتا جاؤں اور یہ عمل دید، اور یہ فعل وصال کی لذت بار بار دہراتا بھی جاؤں تو میرا شوق کبھی بھی نہ تھک سکے گا اور نہ ختم ہو سکے گا۔ جوں جوں وصال کی لذت اور دید کی حلاوت ملتی جائے گی یہ شوق بڑھتا جائے گا، حتیٰ کہ میں اپنے جسم کے ریشے ریشے اور لوں لوں کو آنکھ بھی بنالوں تو پھر بھی اس کی تشنگی ٔدید پوری نہ ہوگی۔

مرشد کی دید افضل عبادت ہے:

مرشد کامل کی دید کے لیے بڑھتے ہوئے احساسات وجذبات کو عبادت قرار دیتے ہوئے یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

مرشد دا دیدار ہے باھُو مینوں لکھ کروڑاں حجاں ھُو(۴۰)

وہ مرشد کامل جو فنا فی اللہ ہے، ایسے مرشد کی دید اور زیارت میرے لیے ایک عبادت ہے، حج بھی درحقیقت ایک دید اور زیارت کا نام ہے۔ وہ مرشد کامل جس نے خود کو فنا فی اللہ کر دیا ہے ایسے مرشد کا دیدار میرے لیے لاکھوں حجوں کا ثواب رکھتا ہے

اور مَیں مرشد کے دیدار کے باعث اپنے اعمالِ حیات کو جہتِ ثواب پر جہاں استوار کرتا ہوں وہاں ان اعمال پر اللہ کی بارگاہ سے بے حساب ثواب کی امید بھی رکھتا ہوں۔ مرشد کے دیدار کے شوق کا غلبہ میرے تن و من پر اس قدر اپنا تسلط پا چکا ہے کہ مرشد کامل ہزاروں میلوں پر بھی بستا ہے تو مجھے اپنے قریب ہی قریب نظر آتا ہے۔ اس لیے فرماتے ہیں:

مرشد وَسّے سَے کوہاں تے، مینوں دِسّے نیڑے ھُو(۴۱)

مرشد کامل اگر چہ ظاہری طور پر میری آنکھوں سے بڑی دُور سینکڑوں میلوں اور فاصلوں پر بستا ہے، یہ فاصلے ظاہری آنکھ کے ہیں مگر جب اپنے مرشد کو دل کی آنکھ سے دیکھتا ہوں تو اسے بڑا ہی ''اقرب'' اور بہت ہی قریب پاتا ہوں، ظاہری آنکھ دُور دیکھتی ہے جبکہ قلبی آنکھ قریب دیکھتی ہے۔

حضرت سلطان باہو اپنے اسی روحانی سفر کو مطلق اور محبوبِ حقیقی کی طرف بڑھاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ اگر ہم سب کا سفر ''نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡد'' کی طرف ہو جائے۔

مذہبی فسادات کا حل:

ہماری سوچ کی جہت اور عمل کی سمت ''نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ'' کی طرف پھر جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے تمام معاشرتی مسائل اور مذہبی اختلافات، تمام فرقہ وارانہ تنازعات، اپنی فضیلت و برتری کے تمام تر تشخصات اور معاشرے میں پائے جانے والے مختلف النوع فسادات کا خاتمہ ایک ہی اصول کو اختیار کر کے ممکن ہے، اور وہ ہے کہ مسلم معاشرہ کا ہر ایک فرد اپنی سوچ اور عمل میں یہ تصور رکھے: ''نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡد''(۴۲)(ہم انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں)۔

حضرت سلطان باہو اس اصول کو اپنے کلام کے منہج پر یوں بیان کرتے ہیں:

نَحۡنُ اَ قۡرَبُ لبھ لیوسے باھُو جھگڑے کل نبیڑے ھُو(۴۳)

جب ہم نے ''نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡد'' کے راز کو اپنی ذات میں پالیا تو بُعد اور دُوری کے سارے جھگڑے اور تنازعے خود بخود ختم ہو گئے۔

ایک مرشد کامل کا کام سالک کو معرفتِ الٰہی اور قربتِ الٰہی کی منزل پر پہنچانا ہے۔ جس دَر سے آج بھی یہ خیرات مل رہی ہے، وہی وہ خانقاہ ہے جسے قرونِ اُولیٰ کی رُوحانی درسگاہوں سے ربط ہے، اور عصرِ حاضر میں یہی حقیقی روحانی درگاہ ہے اور جس کا ساقی ہی وہ مرشد ہے جس کا تصور اکابرائمہ تصوف ورُوحانیت نے اپنی امہات کتب تصوف اور ملفوظات و ارشادات، مکتوبات اور اپنی صحبتوں اور تذکروں میں دیا ہے۔ تصورِ شیخ کے تناظر میں حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ ان اولیاء اللہ کے افکار کی ترجمانی اپنے اس شعر میں یوں کرتے ہیں:

مَیں تاں بھُلّی وَیندی ساں باھُو مینوں مرشد راہ وِکھایا ھُو(۴۴)

یعنی مَیں اس جہاں میں آیا تو میری رُوح جو حالتِ وصل میں تھی وہ یہاں آ کر حالتِ فصل میں چلی گئی۔ دنیا کی خواہشوں نے اس پر غلبہ پالیا، یہ دنیوی حاجتوں، ضرورتوں اور آرزؤں کی اَسیر ہو گئی اور اپنے محبوبِ حقیقی کو بھول گئی، دنیا کی رنگینیوں اور چاشنیوں میں یہ

کھوئی ہوئی تھی، ربّ کے فضل وکرم سے اس کو ایک رہبر حیات مل گیا، ایک مرشد کامل میسر آ گیا اور ایک پیشوا برحق نظر آ گیا، اس نے اس کو "وَاذْکُر رَّبَّکَ إِذَا نَسِيتَ" (۴۵) (اور اپنے ربّ کا ذکر کرو جب اسے بھول جاؤ) کا وظیفہ پڑھایا، یادِ مولا کے اوراد کرائے اور مسلسل توجہ سے محبوب کی یاد کے وظائف سے گزارا تو اس کا بھول پن، یاد میں بدل گیا، اس کا نسیان ختم ہو گیا اور مرشد کامل کی وجہ سے یہ عرفانِ الٰہی کی وادی میں آ گیا۔ پس ایک مرشد کامل کا یہی وظیفۂ حیات ہے اور یہی فرضِ روحانی ہے اور یہی اس کا واجب منصبی ہے کہ وہ بھولوں ہوؤں کو مولا سے واصل کر دے۔ اس لیے فرماتے ہیں:

باجھوں مرشد کجھ نہ حاصل توڑے راتیں جاگ پڑھیوے ھُو(۴۶)

مزید برآں فرماتے ہیں کہ:

سبھے مطلب حاصل ہوندے باھُو جد پیر نظر اک تکے ھُو

انوارِ الٰہیہ کا مھبط انسانی قلب ہے:

اب ہم حضرت سلطان باھو کے مقبولِ عام کلام کے ان پہلوؤں کا مطالعہ کرتے ہیں جن کے ذریعے وہ عامۃ الناس کو ہدایت و راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ آپؒ کے کلام کا یہ مصرعہ "دل دریا سمندروں ڈھوگے" بھی معاشرتی اور عوامی سطح پر ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے، پورا مصرع کچھ یوں ہے:

دل دریا سمندروں ڈُوگھے کون دلاں دیاں جانے ھُو(۴۷)

عرفاء و اولیاء اللہ کے دل ایسے دریائے عمیق ہیں جو سمندروں سے بھی زیادہ گہرے ہیں، یہ دل اپنے اندر معرفت الٰہی کا ایک بے پایاں جہاں آباد کیے ہوئے ہیں، ایک انسان اپنے دل میں نہ جانے کیا کیا چیزیں آباد کرتا ہے جبکہ یہ دل محبوبِ حقیقی کا ٹھکانہ ہیں۔ وہی ان دلوں کا اصل مسکن ہے انسان کی حیثیت اس گھر کے جاروب کی ہے، اس گھر کی صفائی وستھرائی، طہارت و نظافت اور پاکیزگی و نفاست کی ذمہ داری عبادت و طاعت الٰہی کے ذریعے اسے تفویض کی گئی ہے جس نے جتنا اس دل کو پاکیزہ کر لیا اس میں اس مکینِ اصلی کا آنا جانا لگ جائے گا اور یہ معرفتِ حق سے آشنا ہو جائے گا۔ یہ دل اپنے اندر بے شمار رازوں کو سموئے ہوئے ہیں۔ ان دلوں پر نظر کرنا اور ان دلوں کے احوال کو جاننا ہی حقیقت عرفان ہے۔

حدیث قدسی ہے، رسول اللہ روایت کرتے ہیں، باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبد المؤمن (۴۸)

"زمین و آسمان کی وسعت میرے لیے کافی نہیں ہے البتہ میرے بندے کا دل میرے سمانے کے لیے کافی ہے۔"

حضرت سلطان باھو فرماتے ہیں کہ ربّ کی معرفت اور قربت اور اس کا وصال انسان کو اُس وقت میسر آتا ہے جب انسان کا دل پاک وصاف، مزکّی و مصفّٰی اور اچھا و عمدہ ہو جائے اور اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

باھُو ربّ ملدا دِلیاں چنگیاں ھُو(۴۹)

عشقِ الٰہی حقیقتِ ایمان ہے:

انسانی زندگی میں محبت وعشق کی کیا اہمیت ہے، حضرت سلطان باھو اپنے کلام میں اس حقیقت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ جب انسان کی اللہ سے محبت اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ وحدت پر یقین اور ربّ تعالیٰ کی شانِ توحید پر ایمان بڑھتا ہے تو وہ: وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۵۰) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ اور عرفاء انسان کی محبتِ الٰہی کی اس کیفیت کو عشقِ حقیقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ عشق اور ایمان کا تقابل کرتے ہوئے حضرت سلطان باھوؒ فرماتے ہیں:

جس منزل نوں عشق پچاوے ایمان نوں خبر نہ کوئی ھُو(۵۱)

حقیقت امر یہ ہے کہ جس منزل پر عشق پہنچاتا ہے ایمان کو اس منزل تک کوئی خبر نہیں ہوتی، اس لیے کہ ایمان کی منزل جنت ہے اور عشق کی منزل ذات حق تعالیٰ ہے۔ ان دونوں میں سے ایمان کا راہی ہر کوئی ہوتا ہے جبکہ عشق کی منزل کا مسافر کوئی کوئی ہوتا ہے۔ اس لیے حضرت سلطان باھوؒ فرماتے ہیں:

ایمان سلامت ہر کوئی منگے ، عشق سلامت کوئی ھُو(۵۲)

ایمان کی سلامتی تو ہر شخص طلب کرتا ہے، ہر شخص کی دلی آرزو یہی ہے کہ اس کا ایمان سلامت رہے مگر عشق کی سلامتی صرف اور صرف خاصانِ حق ہی طلب کرتے ہیں۔ ایمان کی سلامتی کا طالب ہر کوئی ہے جبکہ عشق کی سلامتی کا طالب کوئی کوئی ہے۔ اس لیے عشقِ حقیقی کے طالب صرف خواص ہوتے ہیں اور عشق کی سلامتی کے راز کو بھی حضرت سلطان باھوؒ یوں فاش کرتے ہیں:

سچا عشق حسینؓ ابن علیؓ دا باھو سِر دیوے راز نہ بھنّے ھُو(۵۳)

یعنی کھرا اور سَچا اور سُچا عشق تو حضرت امام حسین کو حاصل ہوا ہے جنہوں نے عشق حقیقی کی وادی میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا، حتیٰ کہ اپنی جان بھی فدا کر دی اور اپنا سر بھی نیزے پر چڑھا لیا، اتنی عظیم قربانی دے کر بھی محبوب کا راز نہ توڑا اور محبوب کے راز کو افشا نہ کیا، اس رازِ حق کو رازِ جان بنا لیا، اپنی جان دے دی مگر راز کو راز ہی رہنے دیا۔ عشق کے اسی مضمون کو علامہ محمد اقبال بھی یوں بیان کرتے ہیں:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق ، صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق(۵۴)

عشق کی نشانی حضرت سلطان باھو یہ بیان کرتے ہیں کہ جس وجود میں بھی عشقِ حقیقی ہوگا وہ ظاہر ہو کر رہے گا، یہ خوشبو کی طرح ہر طرف خود ہی پھیل جاتا ہے، اپنے وجود کو آپ ہی منوا لیتا ہے، اسے کسی سہارے اور آسرے کی ضرورت نہیں رہتی، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے بہر صورت منکشف ہونا ہے۔ اس لیے حضرت سلطان باھو فرماتے ہیں:

عشق مُشک نہ چھپے رہندے ظاہر تھین اِتھاہیں ھُو(۵۵)

خلاصۂ کلام:

حضرت سلطان باہو کے کلام کا ایک ایک شعر اور اس کا ایک ایک مصرع معانی و مطالب کا ایک سمندر اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اُن کی ہر بات عقل کو اپیل کرتی ہے اور دل کے تار چھیڑتی ہے۔ وہ اپنے کلام کی فکری بلندی کے ذریعے عقلمندوں کو بھی متاثر کرتے ہیں اور اپنے کلام کی روحانی برتری کے ذریعے عاشقوں کو بھی اپنا ہمنوا بناتے ہیں۔ وہ اپنے کلام کو اللہ کی توحید و وحدانیت اور رسول اللہ کی محبت و اطاعت اور عامۃ الناس کی رشد و ہدایت کا، فی زمانہ ایک بہت بڑا موثر ذریعہ بناتے ہیں۔ اُن کا کلام اُن کے زندہ دل سے ظاہر ہوا ہے اس لیے وہ ایک زندہ و تابندہ کلام ہے، جو بھی اسے پڑھتا ہے اور سنتا ہے اور سمجھتا ہے وہ اس کے کلام زندہ ہونے کی شہادت دیتا ہے اور اس کلام کا قاری، خود اس حقیقت کا شاہد بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سارا کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد بھی اس کلام کے ایک عام قاری کا موقف یہی رہتا ہے کہ:

عارف دی گل عارف جانے کیا جانے نفسانی ھُو(۵۶)

عرفاء اور اولیاء کی بات کو عرفاء ہی بہتر جان سکتے ہیں اور وہی ان کے کلام کے راز کو پا سکتے ہیں اور وہی ان کے کلام کی گہرائی کا ادراک کر سکتے ہیں۔ ان کی اشاراتی اور تلمیحاتی باتوں کا کماحقہ فہم ان کے ہم جنسوں کو ہی حاصل ہو سکتا ہے غیروں اور نفس کے اَسیروں کو کیا معلوم کہ حقیقت کیا ہے اور معرفت کیا ہے؟ اور محبوب حقیقی سے وصل و وصال کی حقیقتوں اور کیفیتوں سے انہیں کیا حاصل ؟۔۔۔وہ تو نفس کے پجاری ہیں اور بندۂ نفس ہیں۔ بہر حال حضرت سلطان باہو کے کلام کا حاصل بھی یہ ہے اور اس مضمون کا نکتۂ کمال بھی یہ ہے جسے حضرت سلطان باہو ان الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

باجھ وصال اللہ دے باھُو دنیاں کُوڑی بازی ھُو(۵۷)

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ واضح کرتے ہیں کہ:

باجھ وصال اللہ دے باھُو سبھ کہانیاں قصے ھُو

اے باہو! اللہ تعالیٰ کے وصل و وصال کے بغیر بقیہ سب کچھ طرح طرح کی کہانیاں اور قصے و واقعات ہیں، اس لیے وصالِ الٰہی ہی ایک عاشقِ حقیقی کی منزل ہے، وہ اسی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے اور وہ اسی منزلِ شوق کی طرف مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے، اسے نہ خوفِ دوزخ ہے نہ شوقِ بہشت ہے اور نہ ذوق حصول دنیا ہے۔ اس لیے دنیا تو سرے سے اس کے نزدیک ایک کُوڑی بازی یعنی ایک جھوٹی بازی ہے، یہ مقصود نہیں ہے۔ مقصود و مطلوب مولا ہے، اس کی معرفت اور اس کی قربت اور اس کا وصال ہی اصل الاصول ہے، بقیہ سب نقل ہے۔ اُسے پانا ہی انسان کا مقصود ہے اور اُس کا وصال ہی ایک بندے کا مطلوب ہے، بندے کی معراج، شانِ بندگی میں ہے، اور شانِ بندگی کی بلندی وصلِ الٰہی میں ہے۔ یہی اصل رازِ حیات ہے اور یہی حقیقت کمال و جمالِ زیست ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابیاتِ باھوؒ،ص۱۴۹

۲۔ ابیاتِ باھوؒ،ترجمہ وشرح وتحقیق سلطان الطاف علی، پروفیسر، الفاروق بک فاؤنڈیشن بھیرہ۔ص۱۴۹

۳۔ ابیاتِ باھوؒ،ترجمہ وشرح سلطان الطاف علی، پروفیسر، کاروان پریس دربار مارکیٹ لاہور۔ص ۱۱۰

۴۔ سورہ الذاریت۵۱:۲۱

۵۔ اقبالؒ، بالِ جبرائیل، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۸،ص۳۱

۶۔ سورہ حم السجدہ۴۱:۵۳

۷۔ ابیاتِ باھوؒ،ترجمہ وشرح، سلطان الطاف علی، پروفیسر،ص ۲۱۳

۸۔ ایضاً

۹۔ جلال الدین رومیؒ، مثنوی بحر العلوم، نولکشور ۱۲۹۳ھ،ص ۵۴

۱۰۔ سیدوارث علی شاہؒ، اردو ترجمہ پروفیسر حمید اللہ ہاشمی، شیخ بشیر احمد اینڈ سنز اردو بازار لاہور، ۲۰۰۱ئ۔ص ۱۳۵، کافی نمبر ۵۲

۱۱۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص۱۶۵

۱۲۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۲۹۳

۱۳۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص۱۶۹

۱۴۔ ابوداؤد، السنن، کتاب البیوع، باب فی الرھن، ۳_۲۸۸، الرقم:۳۵۲۷

۱۵۔ سورہ یونس:۶۲

۱۶۔ امام نسائی، السنن الکبری، الرقم:۱۱۲۳۵ /عبداللہ ابن مبارک، کتاب الزھد، ج۱،ص ۷۲

۱۷۔ ابیاتِ باھوؒ،ص۲۱۶

۱۸۔ سورہ غافر ۴۰:۴۴

۱۹۔ سورہ الرحمٰن ۵۵:۲۷

۲۰۔ سلطان باھوؒ، عین الفقر، حصہ دوم، شرح نظام الدین۔ص ۷

۲۱۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص۴۳۹

۲۲۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص۲۸۱

۲۳۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۳۲۸

۲۴۔ ابیاتِ باھوؒ۔۵۳۴

۲۵۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۳۹۳

۲۶۔ سورہ فاطر ۳۵:۱۵

۲۷۔ سورہ محمد ۴۷:۳۸

۲۸۔ سورہ الذاریت۵۱:۵۰

۲۹۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۵۷۱

۳۰۔ ابیاتِ باھوؒ۔ ۲۴۳

۳۱۔ ابیاتِ باھوؒ۔ ۵۰۶

۳۲۔ سورہ الشمس ۹۱:۹۔۱۰

۳۳۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۶۶

۳۴۔ سورہ فصلت ۴۱:۳۰

۳۵۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۳۶۲

۳۶۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۱۱۵

۳۷۔ امام بخاریؒ، صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، ج ا،ص ۲۵

۳۸۔ ابیاتِ باھوؒ۔ ۶۳

۳۹۔ ابیاتِ باھوؒ۔ ۹۹

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ ابیاتِ باھوؒ۔ ۵۴۶

۴۲۔ سورہ ق ۵۰:۱۶

۴۳۔ ابیاتِ باھوؒ۔ ۵۴۶

۴۴۔ ابیاتِ باھوؒ۔ ۲۱۱

۴۵۔ سورہ الکہف ۱۸:۲۴

۴۶۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۲۴۶، ۳۷۱

۴۷۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۲۹۷

۴۸۔ فریدالدین مسعود ابن ابی بکر، رسالہ گنج الاسرار

۴۹۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۲۶۴

۵۰۔ سورہ البقرہ ۲:۱۶۵

۵۱۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۹۶

۵۲۔ ایضاً

۵۳۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۴۴۷

۵۴۔ اقبالؒ، بال جبرائیل،ص ۴۰

۵۵۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۱۰۵

۵۶۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۳۵۱

۵۷۔ ابیاتِ باھوؒ۔ص ۵۸۰